ماہنامہ

اِنذار

اگست 2017ء

مدیر
ابویحییٰ

جب آپ خامی ڈھونڈنے کا فیصلہ کرلیں
تو آپ ہر کام میں اور ہر شخص میں
خامی نکال سکتے ہیں

www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

اگست 2017ء ذوالقعدہ 1438ھ

جلد 5 شمارہ 8

ابویحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ــــ 25 روپے

سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے

بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے

(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)

بیرون ملک 2500 روپے

(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیرئر آرڈر یا ڈرافٹ)

نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر

سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.

فون: 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.org

دنیا کا آئل ٹینکر

عید سے ایک دن قبل پٹرول سے بھرا ایک ٹینکر کراچی سے بہاول پور جاتے ہوئے احمد پور شرقیہ کے قریب ٹائر پھٹ جانے کے سبب الٹ گیا۔ پٹرول کھیتوں میں بہنے لگا تو قریبی بستیوں کے سیکڑوں لوگ اسے جمع کرنے کے لیے اکٹھے ہوگئے۔ عین اس وقت جب یہ لوگ پٹرول جمع کرنے میں مصروف تھے، پٹرول میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سو پچاس سے زائد لوگ آگ کی زد میں آکر ہلاک ہوگئے۔

اس واقعے کو دیکھنے کے کئی زاویے ممکن ہیں۔ لیکن ایک زاویہ ایسا ہے جسے دیکھنے کی ہم سب کو بہت ضرورت ہے۔ یہ وہ زاویہ ہے جسے حضرات انبیا علھیم السلام ہمیشہ دکھاتے آئے ہیں۔ اس زاویے میں دنیا کی تمثیل پٹرول سے بھرے ٹینکر کی ہے۔ عام لوگ خدا کی رضا و غضب سے بے نیاز ہو کر اس پٹرول یعنی متاع دنیا کو سمیٹنے میں مشغول ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں مفت خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ کوئی مال ذخیرہ کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی شہرت و ناموری کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کوئی طاقت و قوت کو جمع کرنے میں مصروف ہے۔

سب بے خبر ہیں کہ دنیا کے اس آئل ٹینکر نے ہر حال میں پھٹنا ہی ہے، اس کے بعد ہر پٹرول جمع کرنے والے کو بدترین آگ کا سامنا کرنا ہوگا۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے، عمل صالح کیا، حق کی تلقین کی اور اس پر صبر کی تاکید کی۔

ہم سب اسی وسیع تر تمثیل کا حصہ ہیں۔ لازم ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو مال، شہرت اور طاقت کی اس دوڑ میں خدا کی حدود آشنائی میں جیتے ہیں۔ جو لوگ غافل رہتے ہیں، جلد یا بدیر آگ نے ان کو جکڑ لینا ہے۔ یہ آگ صبح و شام ان کی کھال جھلسا دے گی۔ پھر یہ کھال ان کو دوبارہ لوٹا دی جائے گی تاکہ وہ دوبارہ آگ کی غذا بن جائے۔ یہ حادثہ اسی زیادہ بڑے حادثے کی ایک عملی یاددہانی ہے۔ کاش ہم لوگ اپنے آئل ٹینکر کے پھٹنے سے قبل یہ حقیقت سمجھ لیں۔

اسباب اور کھجور

قرآن مجید کی سورہ مریم میں حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے جس میں انھیں ایک فرشتہ، بن باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری دیتا ہے۔ قرآن کے مطابق جب حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ سیدہ مریم کو ہدایت کرتا ہے کہ کھجور کے تنے کو ہلائیں تو تازہ کھجوریں نیچے گر جائیں گی جنہیں کھا کر وہ اس مشکل وقت کو کاٹیں۔ کھجوروں کے متعلق جدید تحقیق سے اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ حمل اور پیدائش کی تکلیف کو کم کر دیتی ہیں۔ اس نے یقیناً حضرت مریم کو بھی آسانی اور فائدہ دیا ہوگا۔

یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے سبق آموز ہے۔ مگر ہماری قوم کے لیے جو اسباب سے زیادہ دم اور تعویذوں پر بھروسہ کرتی ہے ایک اہم سبق موجود ہے۔ اس واقعے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی بن باپ کے پیدائش کے لیے تو فرشتے کو بھیج دیا لیکن پیدائش کی تکلیف ہلکی کرنے کے لیے فرشتے نے کوئی معجزہ کرنے کے بجائے عالم اسباب کی ایک چیز کی طرف رہنمائی کر دی۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اسباب مقرر کر دیے ہیں، وہاں وہ معجزات نہیں کرتے۔ وہاں اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اسباب کو دریافت کر کے ان کو استعمال کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ معجزات نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ہوا کرتے ہیں۔ عام لوگوں کو اسباب تلاش کرنا چاہئیں اور ان کے مطابق حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔ جب ہم یہ کریں گے اللہ کی مدد آئے گی۔ ایک نازک لڑکی نہ ہاتھ سے کھجور کے تنے کو ہلا سکتی ہے نہ اس طرح درخت سے کھجور گرائی جا سکتی ہے۔ مگر جب انسان اسباب اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد کرتے ہیں۔ انسان اسباب کے درخت کو ہاتھ سے ہلانے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ہر ''درخت'' اللہ کے حکم سے اپنی ''کھجور'' گرا دیتا ہے۔ یہی اس واقعہ کا اہم ترین سبق ہے۔

شوق اور خوف

قرآن مجید کی سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔اس سورت کی آیت 17 میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ پوچھتے ہیں کہ موسیٰ یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے۔اس کا جو جواب اس جگہ نقل ہوا اس میں بڑی بصیرت ہے۔

سیدنا موسیٰ نے کہا کہ یہ میرا عصا ہے۔اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں، بکریوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے میرے دوسرے کام بھی ہوتے ہیں۔سوال کا اصل جواب تو وہی تھا جو انھوں نے پہلے جملے میں دے دیا کہ یہ میرا عصا ہے۔مگر سوال کی نوعیت سے ان کو اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان پر خصوصی عنایت ہوئی ہے۔آسمان و زمین کا مالک کسی بندے سے براہ راست بات کرے اور وہ بھی ایک ذاتی سوال کی شکل میں۔ چنانچہ انھوں نے یہ بتانے کے بعد کہ میرے ہاتھ میں عصا ہے، بصد شوق تفصیل سے یہ بتانا شروع کیا کہ اس عصا سے وہ کیا کیا کام لیتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے یہ بتایا کہ وہ اس عصا پر ٹیک لگاتے ہیں۔یہ بتایا کہ وہ اس سے بکریوں کے لیے پتے جھاڑتے ہیں۔لیکن اس کے بعد آنے والا تیسرا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ پچھلی دو باتیں کہتے ہوئے ان کو احساس ہوا کہ شوق اپنی جگہ لیکن یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ وہ کس ہستی سے بات کر رہے ہیں۔ان کا مخاطب وہ عالم الغیب ہے جس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ خدا کی عظمت کا یہ احساس جیسے ہی تازہ ہوا انہوں نے اپنے کلام کو مختصر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے میرے اور بھی کئی کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے انسان کو جو تعلق ہونا چاہیے وہ بیک وقت شوق اور خوف کے جذبات کا امتزاج ہونا چاہیے۔خدا کی ہستی کا یہ شوق اور اس کی عظمت کا یہ احساس ایک سینے میں کس طرح جمع ہوتا ہے، حضرت موسیٰ کا یہ کلام اس کی بہترین مثال ہے اور ہر اس شخص کے لیے بہترین نمونہ ہے جو اپنے رب سے ملاقات کا خواہشمند ہو۔

شکر اور صبر

حضرت ایوب علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ مال و دولت سے نواز رکھا تھا۔ان کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔جبکہ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو گدھے بار برداری کے لیے ان کے پاس تھے۔ان کے زمانے میں ان جیسا مال و دولت والا کوئی اور نہ تھا۔

ان نعمتوں کے باوجود حضرت ایوب بڑے نیک، پرہیز گار اور شکر گزار شخص تھے۔اس پر شیطان نے اپنے ایجنٹوں یعنی حسد میں مبتلا انسانوں کے ذریعے سے یہ وسوسہ انگیزی پھیلانا شروع کردی کہ ان کے پاس اتنا مال ہے تب ہی یہ شکر گزار ہیں۔مصیبت زدہ ہوتے تو خدا ہی کے منکر ہو جاتے۔

یہ وہ وقت تھا جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس عظیم پیغمبر کے ذریعے سے دنیا کو ایک نمونہ دکھایا جائے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ بتائے کہ شکر گزار ہونے کے لیے نعمت ایمان ہونا ہی کافی ہے۔چنانچہ ایک ایک کر کے ان پر مصائب آنا شروع ہوئے۔پہلے مال مویشی گئے۔پھر اولاد ان کی آنکھوں کے سامنے مرگئی۔مگر اس عظیم ہستی کی زبان پر سجدے کی حالت میں ایک ہی جملہ تھا۔رب نے دیا اور رب نے لیا۔رب کا نام مبارک ہو۔

مگر بات یہیں پر نہیں رکی۔اب معاملہ ان کی صحت و عافیت کا آ گیا۔پورے جسم پر پھوڑے نکل آئے۔مگر وہ پیکر وفا اسی طرح صبر و شکر کرتا رہا۔جب درد حد سے بڑھتا تو اللہ سے فریاد کرتے کہ مولا شیطان نے مجھے اذیت اور تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔جب ضبط جواب دینے لگتا تو اللہ کی بارگاہ میں التجا کرتے کہ میں سخت تکلیف میں ہوں اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

قرآن مجید میں ان کی یہی دو دعائیں نقل ہوئی ہیں۔ان میں نہ شکوہ ہے، نہ شکایت۔کوئی بے

صبرا پن ہے نہ اللہ پر کوئی الزام۔ تسلیم و رضا کا عالم یہ ہے کہ ان دعاؤں میں کہیں شفا اور مصائب سے نکلنے کی درخواست تک نہیں کی۔ مگر دو پہلوؤں سے معرفت کا کمال کر دیا ہے۔ پہلی دعا میں یہ کہہ کر خدا کی غیرت کو پکارا ہے کہ تیرے دوست کو تیرے دشمن نے تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی غیرت منداس پر خاموش نہیں رہ سکتا کہ اس کے دوست کو کوئی تکلیف دے کجا یہ کہ تکلیف دینے والا خود اس کا بھی دشمن ہو۔

دوسری دعا میں یہ کہہ کر خدا کی رحمت کو پکارا ہے کہ تیرا دوست تکلیف میں ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ کوئی رحیم اس پر کیسے خاموش رہ سکتا ہے کہ اس کا دوست تکلیف میں ہو اور وہ کچھ نہ کرے۔ چنانچہ اللہ کی رحمت اور غیرت کو جوش آیا اور نہ صرف ان کی ساری تکالیف دور کر دی گئیں بلکہ جتنی اولاد مری تھی، اتنی ہی دوبارہ پیدا کر دی گئی۔ جو مال مویشی گیا تھا، اس کو دوگنا کر کے لوٹا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ مزید ایک سو چالیس برس جیے اور اپنی چوتھی پشت تک کو دیکھا۔

تاہم یہ سارا معاملہ دنیا کے سامنے ایک نمونہ قائم کرنے کے لیے ہوا تھا اس لیے مصائب کے آغاز سے اختتام تک تیرہ برس لگے۔ ایک پوری نسل ان کو بدترین مشکلات میں شکر گزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر جوان ہوگئی۔ پھر پہلے بائبل اور پھر قرآن مجید میں اس واقعہ کو محفوظ کر کے تا قیامت دنیا کے سامنے یہ نمونہ رکھ دیا گیا کہ کوئی شخص ایوب علیہ السلام سے زیادہ دکھی نہیں ہو سکتا، مگر اس کے باوجود بھی ایمان کی قوت سے شکر کرنا ممکن ہوتا ہے۔

اس واقعے کا آخری سبق یہ ہے کہ ان کی آزمائش کے تیرہ برس گزر گئے۔ اور ان کی نعمت والی طویل زندگی کے ایک سو چالیس برس بھی گزر گئے۔ مگر مصائب کا صبر اور نعمتوں پر شکر ہمیشہ کے لیے باقی رہ گیا۔ جب جنت قائم ہوگی تو ایسے صابر و شاکر لوگوں کو وہ جزا ملے گی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ نہ ایوب علیہ السلام کے لیے۔ نہ کسی اور صابر و شاکر شخص کے لیے۔

کردار کی عظمت

قرآن مجید کی سورہ یوسف میں حضرت یوسف کی داستان کو بہترین قصہ کہا گیا ہے۔اس میں ایک طرف ایک عظیم پیغمبر ہے جو سیرت و کردار کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہے اور دوسری طرف رب مہربان ہے جس سے بڑھ کر قدردان کوئی ہستی نہیں ہوسکتی۔اس قصے میں حضرت یوسف کی اعلیٰ سیرت و کردار کے متعدد پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ان میں سے بعض اتنے لطیف ہیں کہ ان کا ادراک کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ہم ایسی ہی ایک مثال قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جس کی طرف قرآن مجید نے کمال خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے۔

حضرت یوسف کے اس قصے میں ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی اس وقت ان کے پاس غلہ لینے کے لیے ان کے پاس آئے جب ہر جگہ قحط پڑا ہوا تھا۔مگر مصر میں حضرت یوسف کے حسن انتظام کی بنا پر غلے کی کوئی کمی نہ تھی بلکہ وہ دوسرے علاقے کے لوگوں کو بھی غلہ دے رہے تھے۔حضرت یوسف کے بھائیوں کے تصور میں بھی نہ تھا کہ جس بھائی کو انھوں نے کنویں میں پھینکا تھا وہ اب مصر کا بادشاہ بن چکا ہے۔ان بھائیوں میں حضرت یوسف کے سگے بھائی بن یامین بھی تھے۔حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دیگر بھائیوں کو تو اپنی اصلیت سے مطلع نہیں کیا تھا،مگر بن یامین کو اپنے بارے میں بتا دیا تھا۔

بھائی غلہ لے کر جانے لگے تو انھوں نے بن یامین کے سامان میں اپنا پانی پینے کا پیالہ رکھوادیا۔اللہ کی قدرت سے یہ ہوا کہ عین قافلے کی روانگی کے وقت ایک شاہی پیمانہ بھی غائب ہوگیا۔چنانچہ ہر طرف اس کی تلاش شروع ہوگئی۔قافلے کو روک کر اس کی بھی تلاشی لی گئی۔شاہی پیمانہ تو نہ ملا مگر بن یامین کے سامان سے حضرت یوسف کا پیالہ برآمد ہوگیا۔کسی کو ان دونوں کے تعلق کا علم تو تھا نہیں،اس لیے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ بن یامین نے یہ پیالہ چوری کیا ہے۔

اس پر ان کے بھائیوں نے فوراً یہ الزام لگا دیا کہ بن یامین نے چوری کی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا بڑا بھائی یوسف بھی چور ہی تھا۔ اس بے ہودہ اور جھوٹے الزام پر قرآن مجید نے حضرت یوسف کی یہ بات نقل کی ہے کہ انھوں نے اپنے دل میں یہ کہا کہ تم بدترین لوگ ہو۔ مگر انھوں نے اپنے ان جذبات کا اظہار ان لوگوں سے نہیں کیا۔

ایک طالب علم کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ قرآن مجید نے ان کے دل میں آنے والے اس خیال کو کیوں نقل کر دیا ہے۔ چاہے ایک غلط بات کے ردعمل میں سہی، مگر اس سے بظاہر حضرت یوسف کا غصہ سامنے آتا ہے جو اس پورے قصے کی روح سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا نہ بظاہر اس بلند کرداری سے جس کا اظہار حضرت یوسف نے ہر قدم پر کیا۔ ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کے دل کی یہ کیفیت نقل کر کے ان کے کردار کی عظمت کو ایک مختلف پہلو سے متعارف کرایا ہے۔

حضرت یوسف کوئی عام آدمی نہیں تھے۔ مصر کے مختار کل تھے۔ وہ چاہتے تو اپنے بھائیوں کی اس بے ہودہ بات پر ناراض ہو کر ان سب کا سر قلم کرا دیتے۔ چاہتے تو ان کو زندان میں ڈلوا دیتے۔ کچھ اور نہیں تو ان کو غلہ دینے ہی سے انکار کر دیتے۔ مگر نہ صرف انھوں نے ان کے پرانے جرائم پر ان کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ عین اس وقت جب وہ ان کے دربار میں کھڑے ہو کر ان پر بہتان لگا رہے تھے جس پر ان کو فطری طور پر شدید غصہ بھی آیا جس کا اظہار ان کے اس جملے سے ہو رہا ہے جو انھوں نے اپنے دل میں کہا، مگر انھوں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ ان کے بہتان پر ان کو کسی قسم کی سزا نہیں دی نہ ان کو غلے سے محروم کیا۔

یہ کردار کی وہ عظمت ہے جسے سامنے لانے کے لیے قرآن مجید نے ان کے بھائیوں کا یہ بہتان اور ان کے دل میں آنے والے اس خیال کو قرآن میں بیان کر دیا۔ صبر و تحمل کا یہی وہ رویہ ہے جو کسی انسان کو اعلیٰ انسان بناتا ہے اور اس کے کردار کو عظیم بناتا ہے۔

نبی کی رحمت نبی کی معرفت

قرآن مجید کی سورہ مائدہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ روز قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت یعنی مسیحیوں کے شرک کے متعلق یہ پوچھا جائے گا کہ کیا حضرت عیسیٰ نے ان سے کہا تھا کہ وہ ان کو اور ان کی والدہ کو اللہ کے ساتھ معبود بنالیں۔ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ صاف صاف کہہ دیں گے کہ انھوں نے ساری زندگی توحید خالص ہی کی دعوت دی تھی۔ یوں گویا حضرت عیسیٰ کی یہ گواہی مسیحی حضرات کے خلاف پوری حجت قائم کردے گی کہ ان کا شرک کرنا اور حضرت عیسیٰ سے مدد و استعانت کا تعلق رکھنا ان کی اپنی گمراہی تھی۔

حضرت عیسیٰ اپنی اس گواہی کے بعد ایک اضافی جملہ اور فرماتے ہیں جو بڑا ہی معنی خیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پروردگار تو اگر میری امت کے ان مسیحیوں کو عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔ اور اگر تو ان کو معاف کردے تو، تو زبردست بادشاہ بھی ہے اور بڑا حکیم بھی ہے۔

یہ جملہ بیک وقت ایک نبی کی رحمت اور اس کی معرفت کا بڑا خوبصورت بیان ہے۔ نبی اپنی امت کے لیے ایک باپ کی طرح شفیق ہوتا ہے۔ اولاد کیسی بھی ہو باپ بہر حال باپ ہوتا ہے۔ خاص کر جب وہ مشکل میں آجائے تو انسان اپنی اولاد کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ یہاں یہ حال تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی گواہی نے مسیحیوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ اس کے بعد ان کی نجات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا تھا۔

چنانچہ رحم کی ایک آخری درخواست کے طور پر حضرت عیسیٰ نے بڑے کمال طریقے سے اللہ کی رحمت اور قدرت کو اپیل کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ عذاب کے مستحق تو ہو چکے ہیں، اب آپ انہیں اگر عذاب دیں گے تو میں بیچ میں بولنے والا کون ہوں۔ میرے لیے تو یہ بس امتی ہیں، مگر آپ کے تو بندے ہیں۔ اور رب کو اپنے بندوں سے سب سے بڑھ کر محبت ہوتی ہے۔ لیکن اگر

آپ ان کو معاف کر دیں تو آپ زبردست بادشاہ ہیں۔ آپ سے کون پوچھ سکتا ہے کہ آپ نے کسی کو کیوں معاف کر دیا۔ اور بات کسی حکمت ہی کی ہے تو سب سے بڑھ کر آپ حکیم ہیں۔ کوئی نہ کوئی راستہ آپ ان کے لیے ڈھونڈ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ نے انتہائی اجمال کے ساتھ اور تمام تر آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی امت کو بچانے کے لیے یہ آخری الفاظ ادا کیے ہیں جو بلاشبہ معرفت کے الفاظ ہیں۔ انھوں نے کوئی سفارش نہیں کی کہ کسی مشرک کی سفارش کا الزام ان پر آجائے۔ مگر سفارش کے لیے جو ممکنہ طور پر موثر ترین اپیل خدا کی رحمت اور قدرت کی بارگاہ میں کی جاسکتی ہے، وہ کی ہے۔

تاہم یہ واضح رہے کہ اس کے بعد کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اُس روز صرف صدق وسچائی ہی انسان کو نفع دے گی۔ یہی سچائی جنت کے بدلے کا انسان کو حقدار بنادے گی۔ اس لیے کوئی جھوٹا اور خاص کر شرک کا جھوٹ بولنے والا اس روز کسی بھلائی کی توقع نہ رکھے۔ ان کے لیے جنت کی کوئی امید نہیں ہے۔ باقی آسمان وزمین اور ان میں موجود ہر چیز کی بادشاہی اور ملکیت اللہ کی ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جنت میں تو نہیں بھیجا جاسکتا۔ باقی جو فیصلہ اللہ تعالیٰ لینا چاہیں وہ لے سکتے ہیں۔ سورہ انعام (128:6)، سورہ ہود (107:11) اور بعض دیگر مقامات کے اشارات سے یہ بات واضح ہے کہ وہ فیصلہ غالباً یہ ہوگا کہ ایک انتہائی طویل مدت گزرنے کے بعد ایسے مجرموں کو جہنم سمیت فنا کر دیا جائے گا۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی انتہائی رحمت کا ظہور ہوگا اور ساتھ میں اس حقیقت کا اظہار بھی کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اصلاً نیک لوگوں کی تلاش کے لیے بنائی تھی۔ دنیا کا یہ کارخانہ جنتی کردار کے لوگوں کی پروڈکشن کے لیے لگایا گیا ہے۔ اہل جہنم اس عمل کا بائی پروڈکٹ ہیں۔ چنانچہ محسوس ہوتا ہے کہ آخر کار اس بے کار بائی پروڈکٹ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے گا۔

سورہ ص کے دو کردار

قرآن مجید کی سورہ ص (38) میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کے پاس دو لوگ دیوار پھلانگ کر داخل ہوئے اور ایک مقدمہ پیش کیا۔ ان میں سے ایک شخص کے پاس ننانوے دنبیاں تھیں اور دوسرے کے پاس فقط ایک۔ جس کے پاس ننانوے دنبیاں تھیں اس نے دوسرے کو اپنی باتوں سے دبالیا اور اس سے یہ مطالبہ کیا کہ اپنی اکلوتی دنبی بھی اس کے حوالے کر دے۔ حضرت داؤد نے بلا تامل اس شخص کو غلطی کا مرتکب ٹھہرایا جس نے دوسرے کی اکلوتی دنبی بھی مانگ لی تھی۔ مگر یہ کہتے ہوئے انھیں اندازہ ہو گیا کہ اس واقعے سے اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ کسی ایسے معاملے کی طرف مبذول کرائی ہے جہاں وہ درست جگہ پر نہیں رہے تھے۔ چنانچہ وہ فوراً متنبہ ہوئے اور اللہ سے درگزر کی درخواست کی اور سجدہ ریز ہو کر اس کے حضور رجوع کیا۔

عام طور پر سارے مفسرین اور قارئین اس قصے کے حوالے سے جس چیز میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں وہ یہ کہ حضرت داؤد کا وہ کیا معاملہ تھا جس کی طرف ان کی توجہ اس طرح مبذول کرائی گئی ہے۔ حالانکہ اس واقعے کو بیان کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حضرت داؤد کے کسی کمزور معاملے کو لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ سیاق کلام تو یہ بتا رہا ہے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد کی عظمت کا غیر معمولی بیان ہے جسے کفار مکہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ کے التفات کا یہ عالم ہے کہ آیت 17 جہاں سے حضرت داؤد کا تذکرہ شروع ہوا ہے یہ کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے کہ اے نبی جو کچھ یہ (کفار) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو۔

قرآن مجید کے اداشناس جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو اپنا بندہ کہہ کر اس کا ذکر کرتے ہیں تو یہ قرب کا سب سے اعلیٰ مقام ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد ان کی اس تسبیح کا ذکر ہے جس کا ساتھ دینے کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا گیا تھا۔ پھر ان کی عظیم سلطنت،

اس کو چلانے کے لیے دی گئی حکمت اور معاملات کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا عظیم روحانی اور مادی سلطنت تھی جس کے وہ بادشاہ تھے۔

اس کے بعد اس واقعے کا ذکر ہے جو شروع میں بیان ہوا۔ اور اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ ایک طرف یہ عظیم بادشاہ ہے جس نے دوسروں کی غلطی میں اپنی کمزوری کو ڈھونڈ لیا۔ جس نے براہ راست توجہ دلانے سے قبل ہی خدا کی عظمت کے آگے خود کو ڈھیر کر دیا۔ جس نے رعایا کے دو عام افراد کے جھگڑے میں خدا کا پیغام ڈھونڈ لیا۔ دوسری طرف مکہ کے یہ سرکش سردار ہیں جن کا ذکر اس واقعے سے پہلے ہوا ہے۔ ان کے پاس خدا کا رسول آ گیا ہے۔ خدا کا پیغام آ گیا ہے۔ ان کو براہ راست نصیحت کی جا رہی ہے۔ ان کے بدترین جرائم پر خوفناک عذاب کی تنبیہ کی جا رہی ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ یہ لوگ ہٹ دھرمی اور تکبر کا شکار ہیں۔ ماننے کے بجائے شک میں پڑے ہیں۔ رسول کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اسے جادوگر اور جھوٹا قرار دے رہے ہیں۔

چنانچہ ایک رویہ ان کفار کا ہے اور دوسرا رویہ حضرت داؤد کا ہے۔ پہلے رویے پر عذاب کی وعید ہے۔ بدر کے روز حسب وعدہ یہ عذاب آیا اور ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ جبکہ حضرت داؤد پر جو انعامات کیے گئے، اس کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ کیسی عظیم روحانی اور مادی سلطنت کے حکمران تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں دو کرداروں کا بیان ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں۔ ایک کردار وہ ہے جن کو براہ راست نصیحت کر دی جائے، ان کے جرائم پر کھل کر تنقید کر دی جائے، اللہ کی سخت پکڑ سے ڈرایا جائے، تب بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسری طرف وہ کردار ہوتا ہے جو تنبیہ سے پہلے اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ جو دوسرے کے معاملات میں اپنے لیے نصیحت کا پہلو ڈھونڈ لیتا ہے۔ جو غلطی کا خیال بھی دل میں آنے پر نادم ہو جاتا ہے۔ سورہ ص کی یہ آیات بتاتی ہیں کہ پہلی قسم کے کرداروں کا انجام بدترین عذاب ہے۔ اور دوسری قسم کے کرداروں کو دنیا میں بھی بھلائی ملتی ہے اور آخرت میں بھی بہترین بدلہ ان کا منتظر ہے۔

نبی کریم کا سچا پیرو

قرآن مجید کی سورۃ القصص آیت 49 میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو مذہب کی تاریخ میں کہی گئی ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ یہ آیت جس سلسلہ کلام میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ کفار کہتے تھے کہ ہم قرآن اور تورات دونوں کو الفاظ کی جادوگری سمجھتے ہیں اور ہم ان دونوں کے منکر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر تم قرآن مجید کو کسی دلیل کی بنیاد پر غلط سمجھتے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو۔ ہمارا نبی اس کی پیروی کر لے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا نبی آخری سچائی پر کھڑا ہوتا ہے۔ اسے کہیں اور سے سچائی کو پانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ عالم کے پروردگار سے ہدایت پاتا ہے جو سراپا حق ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کفار سے یہ کہا کہ تم زیادہ درست بات لے آؤ، ہمارا نبی اس کی پیروی کر لے گا۔

یہ بات آج کے مسلمانوں کے لیے بھی ایک اصولی ہدایت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو ہمیشہ زیادہ درست بات کی تلاش میں رہنا چاہیے۔ اس وقت دنیا میں یہ حیثیت قرآن مجید کے سوا کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے جو خود یہ مانتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب ہے۔ اس سے زیادہ صحیح بات اب کہیں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہر اختلاف کی شکل میں صحیح بات کی تلاش میں قرآن مجید سے رجوع کریں اور اسی کی پیروی کریں۔ چاہے وہ ان کے تعصّبات کے خلاف ہو، چاہے وہ ان کی خواہشات کے خلاف ہو۔ جس نے یہ رویہ اختیار کیا وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیرو ہے، ورنہ وہ کفار مکہ کا پیرو ہے۔

محمد عرفان صدیقی

جاپانی قوم کی کامیابی۔دس وجوہات

دنیا کا ہر انسان ایک کامیاب زندگی گزارنے کی خواہش رکھتا ہے لیکن کامیاب زندگی گزارنے کے لیے انسان کے اندر بہت کچھ خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے اور جب یہ خصوصیات ایک قوم کے بہت سارے لوگوں میں موجود ہوں تو ایک کامیاب معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو کسی بھی کامیاب قوم کی پہچان ہے، کیونکہ جاپان دنیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے اور کسی بھی ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے قوم کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے لہٰذا دنیا کے کئی معروف تجزیہ نگاروں اور ماہرین نے جاپانی قوم کی ان خصوصیات کا جائزہ لیا ہے جن کی بنیاد پر جاپانی قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوم بن کر سامنے آئی ہے، عالمی تجزیہ کاروں کی جانب سے مرتب کردہ ان خصوصیات کا ہم بھی جائزہ لیں شاید بطور قوم ہم بھی جاپانی قوم سے کچھ سیکھ سکیں۔

1۔ جاپانی قوم دنیا میں سب سے زیادہ کام کرنے والی قوم شمار ہوتی ہے یہاں ایک عام آدمی اوسطاً سالانہ 2450 گھنٹے کام کرتا ہے۔امریکہ میں عام آدمی سالانہ اوسطاً 1957 گھنٹے جبکہ برطانیہ میں 1911 گھنٹے جرمنی میں 1880 گھنٹے اور فرانس میں 1690 گھنٹے سالانہ عام آدمی کام کرتا ہے جبکہ جاپانی کاریگر کے کام کا معیار دنیا میں بہترین تصور کیا جاتا ہے، جاپانی ٹیکنیشن کے حوالے سے تصور ہے کہ جاپانی ٹیکنیشن ایک گاڑی نو دن میں تیار کرتا ہے تو اسی معیار کی گاڑی تیار کرنے میں کسی دوسرے ملک کے ٹیکنیشن کو 47 دن درکار ہوں گے اسی طرح ایک جاپانی شہری دنیا کے پانچ آدمیوں کے برابر کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، جاپانی دفاتر میں شام کو اوورٹائم کرنے کا رواج عام ہے لہٰذا کوئی ملازم اگر جلدی گھر جانے کی بات کرتا ہے تو اسے دفاتر میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، عموماً کمپنیاں بھی ایسے ملازمین کو ملازمت دینے سے گریز ہی

کرتی ہیں، صرف ملازمین ہی نہیں بچے کھیلوں کے میدان میں جی توڑ محنت کرتے نظر آتے ہیں تو خواتین گھروں میں صفائی ستھرائی سمیت ہر شعبے میں محنت کرتی نظر آتی ہیں غرض جاپان بطور ترقی یافتہ ملک جاپانی عوام کی محنت کے ثمر کے طور پر موجود ہے۔

2۔ جاپانی قوم میں احساس ذمہ داری اس قدر ہے کہ بچوں سے لے کر بڑوں تک اگر کسی کو بھی کسی کام کا ذمہ دیا جائے تو اس کام کی کامیابی تک مذکورہ فرد پوری ذمہ داری سے اسے مکمل کرنے میں لگا رہے گا۔

3۔ جاپانی معاشرہ انتہائی کفایت شعار سمجھا جاتا ہے، خواتین اور مرد حضرات انتہائی دیکھ بھال کے رعایتی نرخوں پر روزمرہ کے استعمال کی اشیاء خریدتے ہیں جبکہ کئی سپر مارکیٹوں میں مارکیٹ بند ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل کئی اشیا کی رعایتی سیل لگا دی جاتی ہے۔

4۔ جاپان میں وفاداری کو انتہائی اہمیت حاصل ہے صرف ملازمت کی بات کریں تو جاپان میں لوگ بار بار ملازمت بدلنا پسند نہیں کرتے عموماً ایک عام آدمی اپنی ریٹائرمنٹ تک زیادہ سے زیادہ ایک سے دو کمپنیاں تبدیل کرتا ہے، باوجود بہترین کاروباری مواقع کے ملازم اپنی کمپنی اور مالک کے ساتھ ہی وفادار رہتا ہے، جاپان میں ملازمت کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ جاپانی نوکری زندگی بھر کی نوکری ہوتی ہے اور یہی وفاداری جاپان میں زندگی کے ہر شعبے میں پائی جاتی ہے۔

5۔ جاپان دنیا کے ان ملکوں میں سے ہے جہاں نئی نئی ایجادات کے لیے بہت بڑی ریسرچ ٹیمیں ہر وقت مصروف عمل رہتی ہیں جبکہ جو ایجادات ہو چکی ہوں ان میں جدت کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں، جاپان میں ہر سال بہت بڑی تعداد میں پی ایچ ڈی ڈاکٹرز تیار ہوتے ہیں جنہیں جاپانی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھاری مشاہرے پر ملازمتیں فراہم کرتی ہیں تا کہ نئی ایجادات ہو سکیں اور جو ایجادات ہو چکی ہیں ان میں جدت پیدا کی جا سکے یہی وجہ ہے کہ جاپانی اشیاء اپنے

معیار اور جدید ٹیکنالوجی کے سبب پوری دنیا میں مقبولیت رکھتی ہیں۔

6۔ جاپانی قوم نے تاریخ میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ چاہے جتنی بھی مشکلات آئیں جاپانی قوم نے کبھی ہمت نہیں ہاری، دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم حملوں کے باوجود کئی مقامات پر جاپانی افواج امریکہ کے خلاف مزاحمت کرتی رہیں حتیٰ کہ اسلحہ ختم ہونے کے باوجود جاپانی فوجی ڈنڈوں اور ہاتھوں کے بل بوتے پر امریکی افواج کا مقابلہ کرتے رہے، چند سال قبل تک کئی جاپانی فوجی فلپائن میں جنگلات میں چھپے رہے صرف اس لیے کہ انہیں ہتھیار نہ ڈالنے پڑ جائیں، زندگی کے ہر شعبے میں جاپانی قوم نے ہمت نہ ہارنے اور آخری دم تک مقابلے کرنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔

7۔ جاپان میں اخبارات، رسالے اور میگزین پڑھنے کی عادات بہت ہی نمایاں ہیں کسی بھی بس اسٹیشن، ریل یا کافی شاپ پر چلے جائیں اکثر لوگ کچھ نہ کچھ پڑھنے میں مصروف نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے جاپان میں کم آبادی کے باوجود دنیا کے سب سے زیادہ اخبارات اور کتابیں شائع ہوتی ہیں، جاپانی مانگا دنیا بھر میں مشہور ہے، مانگا دراصل کہانیوں پر مشتمل کتابیں ہوتی ہیں جن میں تصاویر کے ساتھ ساتھ کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں کہانی کا مکمل خاکہ بھی شامل ہو جاتا ہے جاپان میں مانگا انتہائی مقبول ہے اور بچوں سے لے کر بڑے تک مانگا بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

8۔ جاپانی قوم میں ٹیم بنا کر کام کرنے کی عادت انتہائی اہمیت کی حامل ہے اس حوالے سے امریکی پروفیسر نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ شاید ایک امریکی پروفیسر ایک جاپانی پروفیسر کو باآسانی کسی بھی شعبے میں شکست دے سکتا ہے لیکن دس امریکی پروفیسر دس جاپانی پروفیسرز کو کبھی شکست نہیں دے سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ دس جاپانی مل کر بیس افراد کا رزلٹ

دیتے ہیں جو کہ جاپانی قوم کی ایک خاصیت ہے۔ جاپان میں بچپن سے ہی بچوں کو ٹیم بنا کر کام کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔

9۔ جاپان میں بچپن سے ہی بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا جاتا ہے، اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے دور سے بچے اپنے اخراجات خود اٹھانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔

10۔ جاپان میں ترقی اور ٹیکنالوجی میں برتری بھی جاپانی عوام کو ان کے کلچر و ثقافت سے دور نہیں لے جاسکی جبکہ بڑوں کا ادب بھی جاپان میں بہت ہی عام سی چیزیں ہیں اور یہی سب مل کر جاپان کو ترقی یافتہ ملک اور قوم بناتی ہیں۔

بشکریہ روزنامہ جنگ

خورشید ندیم

سکول کا طالب علم...... مستقبل کیا ہے؟

جدید تعلیم کے اداروں میں پڑھنے والے طالب علم کا مستقبل کیا ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟

تعلیم کے باب میں ریاست اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر سکی۔ صرف پنجاب میں پچاس فیصد طالب علم نجی اداروں میں زیر تعلیم ہیں۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد، تعلیم اب صوبائی مسئلہ ہے۔ صوبائی حکومتیں ذمہ دار ہیں، مرکزی حکومت نہیں۔ تاریخ یہی ہے کہ تعلیم کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ قوم کے بچوں کو نا اہل کے سپرد کر دیا گیا یا ان کے، جن کے لیے تعلیم جنسِ بازار سے زیادہ کچھ نہیں۔ میری مراد نجی شعبے سے ہے۔

جدید تعلیم کے ساتھ پہلا المیہ یہ ہوا کہ تربیت اس کا حصہ نہ بن سکی۔ اچھا انسان کیسے بنتا ہے؟ یہ سوال تعلیم کا کبھی مرکز نہیں بن سکا۔ قومی پالیسیاں ترتیب پاتی رہیں۔ ضیاء الحق صاحب کے دور میں تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لیے ایک کمیشن بھی بنا جسے آئینی تحفظ حاصل تھا۔ کچھ عرصہ قائم رہنے کے بعد اس کا بجٹ ہی ختم کر دیا گیا۔ نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی۔ مذہب' جو ہمیشہ اخلاقیات کا ماخذ رہا، تعلیمی نظام کا رسمی حصہ ہی بن سکا۔ ایک لازمی مضمون' جسے طالب علم اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان کی مجبوری ہے۔ یہ کبھی طالب علم کی شخصیت سازی سے متعلق نہیں ہو سکا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جدید تعلیم کا نظام شخصیت سازی کے باب میں مکمل ناکام ہو چکا ہے۔

اس تعلیم کا دوسرا المیہ غیر معیاری ہونا ہے۔ جدید مضامین کی جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس کے نتیجے میں معاشرے کو وہ ماہرین میسر نہ آسکے جو اس کی ضرورت تھے۔ اعلیٰ تعلیم کا معاملہ بطورِ خاص تشویش ناک ہے۔ اس کے نتیجے میں نوجوانوں میں غور و فکر کی جو صلاحیت پیدا ہونی چاہیے تھی، وہ نہ ہو سکی۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ساری دنیا جس تحقیقی معیار کو پیش نظر رکھتی ہے، وہ

ہمارے ہاں موجود نہیں۔ میرے پاس بعض اوقات صحافت کے طالب علم آتے ہیں۔ انہیں کالم نگاری کے بارے میں تحقیق کرنا ہوتی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کالم نگاری کی تاریخ سے واقف ہوتے ہیں نہ کالم نگاروں سے۔ ان کے پاس وہ معلومات بھی نہیں ہوتیں جن سے عام قاری بھی باخبر ہوتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ دیگر سماجی علوم کا بھی ہے۔

اس تعلیم کا تیسرا المیہ یہ ہے کہ اس کی کوئی سمت نہیں۔ ایک بھیڑ چال ہے جس کا یہ شکار ہو جاتی ہے۔ عطا الرحمٰن صاحب اعلیٰ تعلیم کے ذمہ دار بنے تو سارا اصرار طبعی علوم پر تھا۔ سماجی علوم کے بارے میں یہ رائے بنی کہ یہ بے معنی ہیں۔ سماجی علوم کے بغیر تعلیم کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ وظائف طبعی علوم کے لیے خاص ہو گئے، جس کے نتیجے میں معاشرے کی اعلیٰ ذہانتیں انہی علوم کا رخ کرنے لگیں۔

اس تعلیم کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ مادی تعمیر طالب علم کا واحد مقصدِ زندگی قرار پایا۔ وہ کسی مضمون کی تعلیم حاصل کرتے وقت صرف یہ پہلو پیش نظر رکھتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اسے روزگار مل سکے گا یا نہیں۔ اس کی سوچ اسی دائرے میں گھومتی ہے۔ والدین بھی اسی زاویے سے سوچتے ہیں۔ طالب علموں کی باہمی گفتگو بھی اسی موضوع پر ہوتی ہے کہ کس شعبے میں روزگار کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس بات کی اہمیت اپنی جگہ مگر تعلیم اگر روزگار کے حصول کا واحد مقصد بن جائے تو پھر معاشرہ اخلاقی انارکی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اقدار، روایت، آداب، ہر چیز غیر متعلق ہو جاتی ہے۔

تعلیم جب ریاست کی ترجیحات میں شامل نہ رہی تو وہ اس بات سے بے نیاز ہو گئی کہ تعلیمی اداروں میں کیا ہو رہا ہے۔ بالخصوص نجی تعلیمی ادارے تو بالکل بھلا دیے گئے۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل کی اخلاقی شخصیت برباد ہو گئی۔ اب تو بے شمار رپورٹس آ چکیں کہ کس طرح ان میں سے

کچھ ادارے منشیات کا گڑھ بن چکے۔ آج اگر ایک طالب علم ان اداروں میں زیرِ تعلیم ہے تو وہ جانتا ہے کہ منشیات کی کتنی اقسام ہیں اور وہ کیسے استعمال کی جاتی ہیں۔ ہماری نسل کے لوگ تو اس سے بے خبر تھے۔ اگر ایک دو نشوں کے بارے میں علم تھا تو اس کا تعلق سماجی مشاہدے سے تھا۔ اس کا تو کوئی امکان نہیں تھا کہ تعلیمی ادارے میں اس کا چرچا ہو۔

اخلاقیات کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق حیا جیسی اقدار سے ہے۔ نجی تعلیم کے اکثر ادارے مخلوط ہیں۔ اختلاط اب کمرہ جماعت تک محدود نہیں، یہ ان مظاہر کو بھی محیط ہے جن کا تعلق حیا باختگی سے ہے۔ کسی گروہ کو یقیناً یہ حق نہیں کہ اپنا تصورِ اخلاق بزور لوگوں پر نافذ کرے لیکن تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اور حکومت کا تو یہ حق ہے کہ وہ سرعام ایسے مظاہر پر نظر رکھے جن کا تعلق ہمارے معاشرے کی مسلمہ اخلاقی روایات کی پامالی سے ہے۔ ہر معاشرے کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے اخلاقی اور تہذیبی وجود کی حفاظت کرے، اس کے لیے وہ کوئی اقدام کر سکتا ہے۔ ریاست جب تعلیم سے غیر متعلق ہوئی تو تعلیمی اداروں کے ماحول سے بھی بے خبر ہو گئی۔

جدید تعلیم سے صرفِ نظر کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان میں سے کچھ ادارے بعض انتہا پسند مذہبی گروہوں کی آماجگاہ بن گئے۔ سب جانتے ہیں کہ دہشت گردی کی وارداتوں میں دینی مدارس کے طالب علم اس طرح ملوث نہیں، جس طرح جدید تعلیمی اداروں کے بعض نوجوان ملوث ہیں۔ جب ریاست نظامِ تعلیم کے مقاصد متعین کرنے میں ناکام رہے تو یہ اس کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں انتہا پسندی نے جنم لیا اور غیر سرکاری اداروں میں بداخلاقی نے۔

یہ خبر خوش آئند ہے کہ ایچ ای سی نے اس سوال کو موضوع بنایا ہے کہ جامعات میں انتہا پسندی کیسے پھیل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سوال کو نظامِ تعلیم کے ساتھ بحیثیت مجموعی جوڑنا چاہیے۔ ہمیں نظامِ تعلیم کی اصلاح کا ایک جامع پروگرام ترتیب دینا ہوگا، جس میں بنیادی سے

لے کر اعلیٰ تعلیم تک، پورے تعلیمی ڈھانچے کو ایک نظامِ اخلاق کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ اخلاقیات کو نصاب ہی نہیں، تعلیمی ماحول کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم مذہبی رواداری کو شخصیت کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ پہلے ہی مرحلے میں دیگر مذاہب کا احترام سکھایا جائے۔ اگر ہم حیا جیسی اقدار کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ بچپن ہی سے شہریوں کو اس بارے میں حساس بنایا جائے۔

آج مذہبی تعلیمی اداروں کی طرح جدید تعلیم کے اداروں کو بھی ریاستی نظم کے تابع کرنا ہوگا۔ کم از کم اس باب میں ضرور وحدتِ فکر ہو کہ یہ مدرسہ ہو یا پھر جدید تعلیم کا ادارہ، اچھا شہری بننا تعلیم کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ یہ سوال اس کے بعد تعلیم کا حصہ بنے کہ طالب علم کو ڈاکٹر بننا ہے یا عالم دین۔ جب تک ہم سب طالب علموں کو یکساں بنیادی تعلیم فراہم نہیں کرتے، ہمیں دونوں نظام ہائے تعلیم کے لیے ایک جیسا تعلیمی ماحول فراہم کرنا ہوگا۔ جو تعلیم اخلاقیات سے صرفِ نظر کرتی ہے، وہ انسانی اوصاف سے عاری ربورٹس تیار کرتی ہے جو ڈاکٹر، انجینئر تو بن جاتے ہیں لیکن لازم نہیں کہ اچھے انسان بھی بنیں۔

ریاست اگر نئے بیانیے پر اتفاق کرے تو اس کے نفاذ کا آغاز نظامِ تعلیم کی اصلاح سے ہوگا۔ دیگر اقدامات ضمنی ہیں۔

بشکریہ روزنامہ دنیا

ندامت توبہ کے دروازے کی اصل کنجی ہے
جبکہ سرکشی اور تاویل اس دروازے کے قفل ہیں

ڈاکٹر محمد عقیل

ذرا نماز ادا کرنا سکھا دیجیے

حضرت، ذرا نماز سے متعلق کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

یہ بتائیں کہ نماز کی نیت زبان سے کرنی ہے کہ دل میں۔

میاں نیت زبان سے کرو یا دل میں کرو، ہر صورت میں خالص ہونی چاہیے۔

جواب کچھ عجیب تھا لیکن اگلا سوال: اچھا ہاتھ کانوں تک اٹھانے ہیں یا کاندھے تک؟

میاں کان اور کاندھے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حقیقت میں تو ہاتھ نفس کی پوجا سے اٹھانے ہیں۔

اچھا ہاتھ کہاں باندھنے ہیں، سینے پر کہ ناف کے نیچے؟

ارے صاحبزادے، ہاتھ ادب سے باندھنے ہیں، جہاں ادب محسوس ہو وہیں رکھ لو۔

سورہ فاتحہ امام کے پیچھے بھی پڑھنی ہے یا چپ رہنا ہے؟

بھائی، جب تمہارا نمائندہ خدا سے سب کے لیے با آواز بلند بول رہا ہو تو تمہیں بولنے کی کیا ضرورت؟ اور جب وہ خاموش ہو تو تمہارے چپ رہنے کا کیا مقصد؟

اچھا سمجھ گیا لیکن یہ آمین زور سے بولنی ہے کہ آہستہ؟

میاں، آمین کا مطلب ہے "قبول فرما"۔ تو کبھی یہ آہ زور سے نکلتی ہے تو کبھی آہستہ۔ دعا کی قبولیت آواز کی بلندی نہیں، دل کی تڑپ کا تقاضا کرتی ہے۔

سنا ہے رکوع میں کمر اتنی سیدھی ہوئی ہو کہ پانی کا پیالہ بھی پشت پر رکھ دیا جائے تو اس کا لیول برقرار رہے؟

میاں، جب غلام جھکتا ہے تو کیا بادشاہ پیالہ رکھ کر کمر کا تناؤ چیک کرتا ہے؟ وہ تو تمہارے بے

اختیار سے جھکنے کو دیکھتا ہے اور بس۔

کیا رکوع سے اٹھ کر دوبارہ رفع یدین کرنا ضروری ہے؟

جناب من، اصل کام تو تکبیر یعنی خدا کی بڑائی بیان کرنا ہے، اب یہ بڑائی ہاتھ اٹھا کر بیان کر لو یا بنا ہاتھ اٹھائے۔

حضور، کیا سجدے میں اتنا اونچا ہونا لازمی ہے کہ ایک چھوٹا بکری کا بچہ نیچے سے نکل جائے؟

میرے دوست، سجدہ تو عاجزی و پستی کی انتہائی علامت ہے۔ بادشاہوں کے بادشاہ کے حضور ناک رگڑتے وقت کس کو ہوش ہوگا ہے کہ اونچائی اور لمبائی کتنی ہے؟

حضرت آپ تو ساری باتوں میں اتنی وسعت اور آپشنز پیدا کر رہے ہیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "صلو کما رائیتمونی اصلی "یعنی نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

ارے بھائی ہم نے تو نبی کریم کو نماز میں روتے ہوئے دیکھا، گڑگڑاتے دیکھا، ادب و احترام کا پیکر بنے قیام میں دیکھا، قرآن کو سمجھ کر پڑھتے ہوئے دیکھا، اپنے رب کے آگے بے تابی سے جھکتے دیکھا، تڑپتے ہوئے سجدہ کرتے دیکھا، قومہ وقعدہ میں بھی دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا، تسبیحات بدل بدل کر پڑھتے ہوئے دیکھا، اپنے رب کو خوف و امید سے پکارتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے یہی دیکھا اور یہی سمجھا کہ نماز کا اصل مغز یہی سب کچھ ہے۔ یہی وہ نماز ہے جس کے لیے نبی نے حکم دیا کہ نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔

بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی کہ آج تک وہ نماز پڑھتا تو رہا، ادا نہ کر پایا۔ موذن حی علی الصلوٰۃ کی صدائیں لگا رہا تھا اور وہ اس حکم پر عمل کرنے کے لیے بے تاب تھا

"صلو کما رائیتمونی اصلی"--- نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے"

نورالہدیٰ شاہ

معافی

پچھلی رات معافیوں کی رات کے طور پر منائی گئی۔ سب نے سب سے کھڑے کھڑے معافی مانگی اور صبح ہوتے ہوتے ہلکے پھلکے ہو کر سو گئے۔ سوشل میڈیا نے اسے اور بھی آسان کر دیا ہے۔ خدا کرے روزِ محشر بھی وائی فائی کام کرتا ہو اور ہم سوشل میڈیا کے ذریعے ایک دوسرے سے یوں ہی رابطے میں ہوں۔ اتنی آسانی سے حقوق العباد کی معافیاں اگر روزِ محشر بھی ہو گئیں تو یقیناً حساب مختصر ہو جائے گا اور جلد از جلد ہم بہشت کے ائر کنڈیشنڈ ہال میں پہنچ چکے ہوں گے۔

معافیوں کی اُس گزر چکی رات میں حیدر آباد سے کراچی کا سفر کر رہی تھی۔ اسی سفر کے دوران سوشل میڈیا پر معافیوں کا لین دین پڑھتے ہوئے مجھے ایک ذاتی تجربہ یاد آ گیا۔

تقریباً چھ سال پہلے دبئ کے ہسپتال میں میری نواسی وقت سے بہت پہلے ساتویں مہینے کی ابتدا میں ہی پیدا ہو گئی۔ میرے گھر کا وہ پہلا بچہ تھی۔ شادی کے چار سال بعد میری بیٹی کے ہاں بچہ ہوا تھا مگر وہ بھی ان حالات میں کہ لگتا تھا کہ مکمل بنی بھی نہیں ہے۔ بالوں بھرا ننھا سا بندر کا بچہ جس کا پورا ہاتھ میری انگلی کی ایک پور پر آتا تھا۔

زندہ رہے گی یا نہیں؟ زندہ رہے گی تو نارمل ہو گی یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب ڈاکٹرز کے پاس بھی نہیں تھا سوائے اس جواب کے کہ سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ ہر روز ڈاکٹرز بتاتے کہ بس ختم ہوا چاہتی ہے، فوراً پہنچو۔ بھاگے بھاگے پہنچتے۔ پھر کچھ سانسیں لینا شروع کرتی تو ایک امید کے ساتھ گھر لوٹتے۔ مگر اگلے دن امید پھر دم توڑ دیتی۔

کبھی بلڈ پریشر ہائی اور کبھی لو۔ ہائی بھی اتنا کہ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں نیلی پڑ جاتیں۔ پوچھنے پر بتایا جاتا کہ اگر بلڈ سرکیولیشن نارمل ہو گئی تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی ورنہ جسم کا ناکارہ حصّہ بن

جائیں گی۔ اسی طرح کبھی شوگر لیول ہائی اور کبھی لو ہو جاتا۔ وینٹ پر بے دم پڑی بچی نے ہماری سانسیں پھلا دیں۔ کبھی دماغ کا ٹیسٹ بتاتا کہ دماغی طور پر نارمل نہ ہوگی۔ کبھی دل میں سوراخ ملتا۔ کبھی آنکھوں کا معاملہ سامنے آ جاتا۔ اوپر سے خرچہ اتنا کہ تین لاکھ درہم پندرہ دن کا بل بن گیا۔ میرا حال یہ تھا کہ میرے سامنے میری اپنی بیٹی کے بھی آنسو تھے اور اس کے بچے کی ناممکن زندگی بھی۔ تھک کر چُور ہوگئی۔ ایک بار تو ڈاکٹر کو بھی کہہ دیا کہ اس کو بچانے کی کوشش نہ کریں۔ بچ بھی گئی تو پتہ نہیں کس حال میں ہوگی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کون ہوتی ہیں زندگی چھیننے کا فیصلہ کرنے والی!

انہی حالات میں ایک دن نماز میں کھڑے ہوئے میں رو دی۔ اللہ کو بے بسی سے مخاطب کر کے کہا کہ یا اللہ مجھ سے ایسا کیا گناہ ہو گیا ہے کہ جس کی یہ سزا ہے؟

بالکل ہی اگلے لمحے چھپاک سے ایک منظر کی تصویر اور اس میں ایک چہرہ صرف ایک سیکنڈ کے لیے میری نگاہ یا ذہن سے گزر گیا اور حیرت کی بات کہ اگلے سیکنڈ میں مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔

پوری نماز اسی کشمکش میں گزری پر یاد ہی نہ آیا۔ اگلے دو دن، دبئی کی سڑکوں پر ہسپتال اور گھر کے بیچ آتے جاتے، رات کو بستر میں، میں اسی کشمکش سے گزرتی رہی۔ پر یاد ہی نہ آیا کہ دیکھا کیا تھا میں نے۔ اپنے جتنے بھی گناہوں اور خطاؤں کی فہرست میرے ذہن میں تھی، انہیں گنتی رہی مگر کسی سے اس منظر کا نشان نہیں مل رہا تھا۔

دو دن بعد اچانک یاد آ گیا کہ وہ کیا منظر اور چہرہ تھا۔ پندرہ برس پرانا وہ واقعہ مجھے کبھی بھی یاد نہ آیا تھا۔ میری ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار لڑکی، شوہر اور حالات کے ہاتھوں ستائی ہوئی، دو بچوں کو ساتھ لیے چھوٹے سے ٹاؤن سے حیدرآباد شفٹ ہوئی تھی کہ اس کا تو مستقبل تاریک تھا

ہی پر کسی طرح بچوں کا مستقبل سنور جائے۔ اس کے بیٹے بیٹی کو میں نے حیدر آباد کے بہت ہی اچھے اسکولوں میں داخل کروایا۔ اسے بچوں سمیت تب تک اپنے گھر میں رکھا جب تک ان کی رہائش کا بندوبست نہ ہوا۔ اسی دوران اس کی بیٹی کا نویں کلاس کا بورڈ کا امتحان بھی ہوا اور وہ بچی اے گریڈ مارکس لے کر پاس ہوگئی۔ رزلٹ کے اگلے دن وہ بچی روتی ہوئی اسکول سے لوٹی۔ پتہ چلا کہ کلاس ٹیچر مس حبیب النسا نے اسے پوری کلاس کے سامنے کہا ہے کہ تم تو اتنے نمبر لینے والی نہیں ہو۔ کس سے سفارش کروائی ہے؟ بھری کلاس میں اس بے عزتی پر وہ بچی بری طرح رو رہی تھی۔ بچی کی حالت دیکھ کر ماں بھی رو رہی تھی۔ اوپر سے بچی نے کہہ دیا کہ اب وہ اس اسکول میں نہیں جائے گی۔

میں ہمیشہ سے مظلوم کے حق کے لیے لڑنے مرنے پر تُل جانے والی رہی ہوں اور اس طرح کے جھگڑوں میں خدائی فوجدار کی طرح کوُد پڑنے کی عادت رہی ہے میری۔

فوراً گاڑی نکالی اور پہنچ گئی اسکول۔ حیدر آباد کے اکثر لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ میں سیدھی پرنسپل کے آفس میں گئی اور ہنگامہ مچا دیا کہ ایک بچی اپنی محنت سے پڑھی ہے۔ ایک چھوٹے ٹاؤن سے مستقبل بنانے آئی ہے اور حالات کی وجہ سے پہلے سے ہی سہمی ہوئی ہے۔ اس کی اس طرح ٹیچر حبیب النسا نے پوری کلاس کے سامنے انسلٹ کی ہے!

میرے ہنگامے پر مس حبیب النسا کو حاضر کیا گیا۔ سادہ سی خاتون مگر چہرے پر ٹھہراؤ۔ کہنے لگیں ہاں میں نے کہا ہے، کیونکہ مجھے وہ بچی اتنی ہوشیار نہیں لگتی جتنے نمبر اس نے لیے ہیں۔ یقیناً یا سفارش کی ہے، یا کاپی کی ہے۔

مجھے پتہ تھا کہ وہ بچی بیچاری سفارش کروانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ نہ ہی اپنی سہمی ہوئی شخصیت کی وجہ سے کاپی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ رٹے مار کر اس نے امتحان دیا تھا اور

اتفاق سے وہی سوال آ گئے جن کے جواب اسے یاد تھے۔

میں مس حبیب النسا پر برس پڑی کہ یہ کہاں کا انصاف ہے! آپ صرف چھوٹے شہر کی بچی دیکھ کر اسے کمتر قرار دے رہی ہیں اور اس کا مستقبل برباد کر رہی ہیں۔ میری آواز یوں بھی بھاری ہے، اس میں مزید گرج آ گئی۔ مس حبیب النسا اسکول کی باقی ٹیچرز کی بھی ناپسندیدہ تھیں۔ سو ان کی کھنچائی کا تماشہ دیکھنے پرنسپل کے آفس کے باہر ٹیچرز جمع ہو گئیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھی خوش تھیں کہ چلو کوئی تو ہے مس حبیب النسا کو سنانے والا۔

قصہ مختصر کہ پرنسپل نے بھی انہیں کچھ سخت الفاظ کہے اور میرے ساتھ میرے گھر آ کر اس بچی کو سوری کہا۔ راستے بھر وہ بھی مس حبیب النسا سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی آئیں، یوں یہ معاملہ تمام ہوا۔

یہ یقیناً میری ایک نیکی تھی۔ ایک مظلوم ماں اور اس کی بچی کی مدد۔

اس کے بعد کے برسوں میں اُس فیملی کے اور بھی کئی مسائل حل کرتے ہوئے اور دکھ سکھ بانٹتے ہوئے یہ واقعہ میرے ذہن سے بالکل ہی اتر گیا۔ یہاں تک کہ بعد میں جب میں خود زندگی کی ایک بہت بڑی آزمائش سے گزری اور اسی فیملی نے میرے ساتھ بُرا رویّہ رکھا تو بھی وہ بات ماضی میں اُن پر اپنے احسان کے طور پر بھی یاد نہ آئی۔ جس طرح انسان اپنے ساتھ برا کرنے والوں پر کیے گئے احسانات فطری طور پر یاد کرتا ہے۔

دبئی میں جب سسک کر نماز میں میں نے اللہ تعالیٰ کو کہا کہ مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے جس کی سزا میں مجھ پر اولاد کی تکلیف آ گئی ہے...... جواب میں وہ حیات اسکول کی پرنسپل مس بلو کے آفس کے اس منظر کی ایک سیکنڈ کی تصویری جھلک اور مس حبیب النسا کا چہرہ تھا۔

میں کراچی آئی، میری ایک کزن مس حبیب النسا کے ساتھ اسی اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں

اور وہ بھی مس حبیب النسا سے ناراض رہا کرتی تھیں، اور ان کی بیٹی سلویٰ مس حبیب النسا سے ان کے گھر پر جا کر قرآن بھی پڑھی تھی اور اسکول میں بھی پڑھی تھی۔ میں نے سلویٰ سے مس حبیب النسا کا نمبر مانگا اور اسے پوری بات بتائی۔

جواب میں اس نے کہا کہ آپ کو صحیح جواب ملا ہے۔ میں نے بچپن مس حبیب النسا کے پاس قرآن پڑھتے ہوئے گزارا ہے۔ وہ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ اور حدیث سند کے ساتھ پڑھی ہوئی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے اپنے ضعیف والدین کی خدمت میں جوانی گزار دی مگر شادی نہ کی کہ والدین کو ان کی ضرورت تھی۔ اپنے آخری دنوں میں ان کے والد بہت ہی ضعیف اور مشکل ہو گئے تھے مگر وہ کبھی اس مشکل ڈیوٹی میں اُف تک نہ کہتی تھیں بلکہ والد کے پیچھے پیچھے دوڑی دوڑی پھرتی تھیں۔ ان کے غسل خانے کے کام بھی وہ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ مگر وہ لوگوں کو اس لیے پسند نہیں کہ منہ پر صاف صاف اور سچ بولتی ہیں۔

سلویٰ سے نمبر لے کر میں نے مس حبیب النسا کو فون کیا۔ میرا نام سن کر وہ خوش ہو گئیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ فوراً کہا کہ آ جائیے۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی میں کراچی سے حیدرآباد سیدھی ان کے گھر ان کے سامنے ایک ہی صوفہ پر بیٹھی تھی۔ وہ کچھ بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں۔ اس بات پر خوش تھیں کہ ایک مشہور رائٹر خاص طور پر ان سے ملنے آئی ہے۔

خوش ہو کر کہنے لگیں کہ میں ریٹائر ہو چکی ہوں اور حیات اسکول چھوڑ چکی ہوں اور ایک پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل ہوں۔ آپ کا فون آیا تو میں نے اپنی ٹیچرز کو بتایا کہ نورالہدیٰ شاہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میری ٹیچرز نے کہا کہ ان کا بیوہ عورت کے حقوق سے متعلق ایک ڈرامہ

چل رہا ہے۔ وہ اس موضوع پر آپ سے شرعی مشورہ کرنا چاہتی ہوں گی۔

میں نے کہا، آپ کو یاد ہے میں حیات اسکول میں آپ کی شکایت لے کر آئی تھی؟

انہوں نے لمحہ بھر سوچا، پھر انکار میں سر ہلا دیا کہ مجھے یاد نہیں۔

میں نے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ پرنسپل کے آفس میں میں بہت اونچی آواز میں سخت الفاظ کے ساتھ آپ سے لڑی تھی۔۔۔آپ کو یاد ہے؟

ذرا سوچا، پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا کہ میں نے تقریباً آپ کی انسلٹ کی تھی، آپ کو یاد نہیں؟

کہنے لگیں کہ مجھے ایسا کچھ بھی یاد نہیں پڑتا۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے میں نے جھک کر ان کے پیر چھو لیے اور ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں نے ایسا کیا تھا اور میں آپ سے اپنے اس عمل کی معافی مانگنے آئی ہوں۔

مس حبیب النسا نے ایک دم سے معافی کے لیے جڑے میرے ہاتھوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ آج اتنے برسوں بعد کیسے یہ خیال آیا اور کس مجبوری نے تمہیں جھکایا ہے۔ انتہائی سنجیدگی سے کہا کہ میں نے آپ کو دل سے معاف کیا۔ اللہ میری معافی آپ کے لیے قبول فرمائے اور آپ جس بھی مشکل میں ہیں اسے آسان کرے اور آپ پر آئی ہوئی آزمائش کو معاف کرے۔

اس کے بعد انہوں نے بات بدل دی۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بڑے شوق سے مجھے کھلاتی پلاتی رہیں۔ دعاؤں کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں انہوں نے بات کا رُخ اس طرف آنے ہی نہیں دیا کہ میں اپنی مجبوری کی اصل کہانی انہیں سناتی۔

چند دنوں بعد میں واپس دبئی لوٹ گئی جہاں اینکیوبیٹر میں ایک ننھی سی جان میں ہماری جان

پھنسی ہوئی تھی۔

میری وہ نواسی اس سال ستمبر میں چھ سال کی ہو جائے گی۔ ماشاللہ بہت ہی شرارتی ہے۔ بہت ہی ذہین اور باتونی۔ گھنگریالے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بالکل ہی گڑیا سی لگتی ہے۔ اللہ نے اسے ہر عیب سے بچالیا۔ بس ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی اوپر کی پور نیلی پڑنے کے بعد دوبارہ نارمل حالت میں نہیں آئی اور انگلی سے جھڑ گئی۔ اس ایک پور کی کمی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ انسان کی تخلیق کا معاملہ کیا ہے اور کس کے ہاتھ میں ہے۔

مس حبیب النسا آج بھی حیات ہیں۔ مگر یہ تجربہ مجھے سکھا گیا کہ معافی دراصل کیا چیز ہوتی ہے اور نیکی کرنے کا تکبر انسان کو کس طرح سزا کا مستحق بناتا ہے اور یہ کہ نیکی خود ایک سوالیہ نشان ہے کہ وہ نیکی ہے بھی کہ نہیں۔۔۔ اسی لیے یہ دریا میں ڈالنے والی چیز ہے۔ اور اس تجربے سے میں نے یہ بھی جانا کہ ہم محض اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم رسمی معافی تلافی کرتے ہوئے پچھلی گلی سے بہشت کی طرف نکل جائیں گے۔

معافی آپ کی انا کے ٹکڑے ٹکڑے مانگتی ہے جو رب کو نہیں چاہئیں، بلکہ اس انسان کے پیروں میں جا کر رکھنے ہوتے ہیں، جس کے ساتھ آپ نے زیادتی کی ہوتی ہے۔

فرح رضوان

ایک اچھی ساس کے کچھ اجزائے ترکیبی

اس مضمون کے کچھ حصے کیے جا رہے ہیں، شروع میں نارمل حالات میں ساس کے کردار میں بہتری کی کچھ یاد دہانیاں ہیں جبکہ آخری حصّے میں ٹیڑھی کھیر سے نبرد آزما ہونے کی تدابیر ہوں گی ۔ان شااللہ۔

جس طرح آپ اپنے بچے کی پیدائش کے ساتھ اسے بڑے ہو کر کامیاب انسان بننے کی تربیت دینا شروع کر دیتی ہیں، اسی طرح اگر آج آپ ماں بن چکی ہیں، تو ابھی سے، اپنے آپ کو ساس بنانے کی تربیت دینا شروع کر دینا چاہیے۔

اگر بیٹا یا بیٹی میں کوئی بھی ایک، یا بالکل اکلوتا ہے، جس میں آپ کی جان اور انگنت ارمان، اٹکے ہوئے ہیں تو، سب سے پہلے تو اس بچے کو اکلوتے لاڈلے ہونے کا اس شدت سے احساس نہ ہونے دیں اور خود کو بھی نارمل والدین جیسے رکھیے ۔ والدین ارد گرد کے دوسرے بچوں پر اعتدال میں رہتے ہوئے اپنا وقت، مال اور محبت سبھی کچھ صرف کریں ساتھ ہی اپنے بچے کو اس شیئرنگ کا عادی بنائیں۔ بچے کو بھی خود انحصاری پر مائل رکھیں۔ساتھ ہی خود بھی اس کی ضرورت سے زائد توجہ اور محبت پانے کی خواہش سے بچنے کی ممکنہ کوشش کریں۔ کیونکہ لڑکی ہو یا لڑکا کل کو اس ایک اکلوتے لاڈلے/لاڈلی کی شادی ہوگی، تب دوسروں سے اسے وقت، مال اور محبت سبھی کچھ ہر صورت بانٹنا ہی ہوں گے۔

بچے ایک سے زیادہ بھی ہوں تب بھی مندرجہ بالا احتیاط لازم ہے ساتھ ہی کھیل یا پڑھائی یا عام زندگی میں بچوں کو ہار تسلیم کر کے مثبت رہنے، اور جیت کر قابو میں رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔

بچوں کی پیدائش کے ہر مرحلے پر آپ کو انگنت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، راتوں کی نیند، دل کا چین سالہا سال کی بیقراری میں بدلتا گیا، کبھی اولاد کے لیے جھکنا پڑا تو کبھی، ٹوٹنا بکھرنا بھی پڑا، غرض اپنی اولاد کے، بیج سے کونپل، پھر پودا اورتن آور درخت بننے تک، جیسی باغبانی آپ نے کی، بالکل ایسا ہی سب کچھ، یا شاید اس سے کہیں زیادہ، ایک اور ماں بھی کرتی رہی...... آپ کی بہو یا داماد کی ماں۔

اس بات کو کبھی فراموش نہ کریں کہ آپ کے ایک بچے پر دوسرا یعنی اس کا جوڑی دار، قدرت کی جانب سے آپ کو بالکل فری، فری، فری ملتا ہے، آپ کو سالہا سال اس کے لیے کوئی ایک بھی مشقت نہیں جھیلنی پڑتی، تو اگر اب خدانخواستہ بہو یا داماد سے کوئی خلاف منشا بات سرزد ہوتی بھی ہے، یا وہ آپ کی پسند کے ہی نہیں، تب بھی، جوڑ تو ان کا اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی رہیں اور سوچیں کہ کیا یہ آزمائش ان تمام تکالیف کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہے جو لمحہ لمحہ کئی سال آپ کو اپنی ہی اولاد سے ملتی رہیں؟

تو کیا اس فری ملنے والے بچے اور اس کے والدین کی تکریم، ہم پر اخلاقی طور پر واجب نہیں ہوتی؟ کیا مسلمان کی آبرو، مال اور خون دوسرے مسلمان پر حرام نہیں؟ تو پھر کیوں ہم ان کی غیبت کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی کسی کی عزت کا حق مارنا ہے۔ طعنہ یعنی لفظوں کے نیزے سے حملہ کرتے وقت کیوں یاد نہیں رہتا کہ سامنے والا بھی مسلمان ہے اور بظاہر ہماری تلخ بات سے اس کا خون بہتا دکھائی نہ بھی دے لیکن جلتا کڑھتا تو ہوگا ہی۔

[جاری ہے]

سوال و جواب

ابو یحییٰ

گناہوں کو چھپانا

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر میں اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں۔ جب میں تقریباً پندرہ سال کا تھا تو مجھ سے گھر میں کام کرنے والی ایک لڑکی کے ساتھ فعل بد کا ارتکاب ہوگیا تھا۔ میری منگیتر نے اپنا ماضی مجھ سے بیان کر کے یہ کہا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپانا چاہتی، مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی ہے کیونکہ میں نے اسے اپنے گناہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں اسے یہ بات بتاؤں یا نہیں۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

(سائل کا نام حذف کر دیا گیا ہے)

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انسان سے جب اس نوعیت کا سنگین جرم ہو جائے تو اس کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیے۔ اس لیے کہ گناہ کی شناعت بہت زیادہ ہے۔ تاہم توبہ کے بعد یہ مناسب نہیں کہ انسان اپنے گناہ کو کسی سے بھی بیان کرے۔ جس شخص کا پردہ اللہ نے ڈھانپ دیا ہو دین ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ وہ اس پردے کو خود چاک کرتا پھرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ اس متعین گناہ کے متعلق کسی سے بھی کچھ نہ کہیں چاہے وہ آپ کی منگیتر کیوں نہ ہو۔ شادی کے رشتے میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ماضی کو کتنا جانتے ہیں یا نہیں۔ اہم

بات یہ ہے ہوتی ہے کہ وہ حال اور مستقبل میں ایک دوسرے کے وفادار رہیں اور ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ ڈالیں۔ کامیاب شادی سمجھوتے سے وجود میں آتی ہے نہ کہ ایک دوسرے کا کچا چٹھا کھولنے سے۔ والسلام علیکم

ابو یحییٰ

شام کی صورتحال

سوال:

شام کی موجودہ صورتحال پر آپ کی کیا رائے ہے اور مسلمان ہونے کے ناطے ہم پہ کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

محمد رضا

جواب:

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ معاملہ صرف شام کا نہیں ہے۔ ہم پچھلے دوسو برس سے ہر تھوڑے عرصے بعد کوئی نہ کوئی ''شام'' بھگت رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں ہندوستان، بیسویں صدی میں ترکی، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا اور جدید دور میں افغانستان، چیچنیا، بوسنیا، عراق اور اب شام اس کی مثالیں ہیں۔ اس مسئلے کی وجہ اور حل اس خاکسار نے اپنی کتاب آخری جنگ میں بیان کردیا ہے۔ آپ اس کا مطالعہ فرمالیجیے۔ جو کچھ اس خاکسار نے عرض کیا ہے اسے لوگوں نے نہیں مانا تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس سے بھی زیادہ گھمبیر صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ والسلام

ابو یحییٰ

ابویحییٰ

نکاح کے بغیر تعلق

محترم بہن　　　　5 جون 2017

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نکاح سے پہلے کسی کے ساتھ جنسی تعلق رکھنا بدکاری ہے۔ یہ نہ صرف سنگین ترین گناہ ہے بلکہ آپ اور آپ کے بچوں کے مستقبل کے لیے بھی انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کے شوہر اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہے تو آپ پہلے ان سے الگ ہوجائیں۔ آج کل خلع لینا بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اپنے موجودہ خاوند سے خلع لے لیجیے اور پھر جس سے چاہیں نکاح کر لیجیے۔ کوئی کتنا ہی مہربان کیوں نہ ہو، میں آپ کو یہ مشورہ ہرگز نہیں دے سکتا کہ آپ اس کے ساتھ نکاح کے بغیر کوئی تعلق رکھیں۔ یہ کسی پہلو سے کوئی درست رویہ نہیں۔

جہاں تک ان صاحب کے آپ پر احسانات کا تعلق ہے تو یاد رکھیے ہم پر سب سے زیادہ احسان اللہ کا ہے اور ہم پر سب سے زیادہ مہربان ہمارا رب ہے۔

آپ انہیں واضح طور پر بتا دیجیے کہ آپ ان کی عنایات کو بہت اہمیت دیتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز نہیں کرسکتیں، قرآن مجید میں زنا کی سزا ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم بیان ہوئی ہے اور آپ اس کے خلاف ہرگز نہیں کرسکتیں۔ لہٰذا پہلے اپنے موجودہ خاوند سے خلع لیجیے، پھر ان صاحب سے نکاح کر لیجیے اور پھر ان کے ساتھ ایک اچھی فیملی لائف گزاریے۔

دعاگو

ابویحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (41)

دعوت کے رد و قبول کے نتائج: موت اور برزخ

قرآن مجید کے مطابق اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ امتحان اصلاً اس شخصیت کا ہوتا ہے جو حیوانی جسم کے اندر خدائی اذن سے پھونکی جاتی ہے۔ قرآن مجید اس انسانی شخصیت کو نفس کا نام دیتا ہے۔ انسانی جسم میں ہر روز لاکھوں کروڑوں خلیے مرتے اور نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر نفس یا انسانی شخصیت وہی رہتی ہے۔ انسان بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اور ایک روز موت اس کے دروازے پر دستک دے کر اس کی مہلت کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اکثر انسانوں کا یہی معاملہ ہوتا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ انسان زندگی کے ان تمام مراحل سے گزرے۔ زندگی بطن مادر ہی میں اور دنیا میں آنے سے قبل یا بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر غرض زندگی کے کسی موڑ پر ختم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کا وقت کب مقرر ہے، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہر انسان کے لیے موت کا فیصلہ اللہ کے اذن کے مطابق طے کر دیا گیا ہے۔ جب کسی کا وقت آ جاتا ہے تو مضبوط ترین پناہ گاہ بھی کسی کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ انسان ہی نہیں زمین کے ہر باسی کا یہی مقدر ہے کہ ایک روز وہ فنا کے گھاٹ اتر جائے۔ یہ صرف خدائے ذوالجلال کی ہستی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

تاہم یہ موت جسم انسانی کے مردہ ہو جانے کا نام ہے۔ انسان کی اصل شخصیت یا روح مرتی نہیں بلکہ موت کا فرشتہ اس انسانی شخصیت کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔ یہ گویا کہ انسان کی ایک

نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس ابدی زندگی کے پہلے مرحلے میں جو موت سے شروع ہو جاتا ہے انسان اپنے حیوانی جسم کے بغیر لیکن اس عقل و شعور اور ان احساسات و جذبات کے ساتھ زندہ ہو گا جو انسان کو انسان بناتی ہیں۔

موت کے وقت اگر مرنے والا ایسا شخص ہوتا ہے جس نے ساری زندگی ان تقاضوں اور مطالبات کو نبھایا ہوتا ہے جو اللہ پروردگار نے مقرر کیے ہیں تو موت کے ساتھ ہی فرشتے ان کو خدائے رحمٰن کی طرف سے سلامتی کا پیغام پہنچاتے اور جنت میں داخلے کی خوشخبری سناتے ہیں۔ یہ گویا زندگی کے خدائی امتحان میں کامیابی کی نقد بشارت ہوتی ہے۔ مرنے والا اگر خدا کا مجرم ہو تو یہ موت ہی اس کی سزا کا نقطہ آغاز بن جاتی ہے۔ چنانچہ فرشتے ان کو مارتے پیٹتے اور ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو جہنم کے عذاب کے خدائی فیصلے سے آگاہ کریں گے۔

چنانچہ ان دونوں گروہوں کے لیے دعوت حق کے رد و قبول کے نتائج موت کے فوراً بعد ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا بلکہ قیامت تک کے اس پورے عرصے میں جاری رہے گا جسے قرآن مجید برزخ یعنی ایک پردے سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اللہ کی راہ میں جان دینے والے شہدا کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انھیں رزق دیا جا رہا ہے۔ جبکہ آل فرعون کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی موت کے ساتھ ہی ان پر عذاب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب قیامت آئے گی تو تمام لوگ اپنے جسم کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے۔ اس وقت لوگ یہی محسوس کریں گے کہ وہ اپنی موت کے ساتھ سو گئے تھے اور اچانک بیدار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت برزخ کی زندگی کا یہ طویل عرصہ ان کو خواب کی طرح محسوس ہو گا۔ لیکن ایک خواب کی طرح جس وقت یہ سزا و جزا پیش آ رہی تھی، انسانی شعور اس کو حتمی اور یقینی سمجھے گا اور سزا کو سزا اور

جزا کو جزا بالکل اسی صورت میں دیکھے گا جیسا کہ اچھا یا برا خواب دیکھنے والا شخص خواب کے دوران میں اسے حقیقت کی شکل میں دیکھتا اور اچھے برے اثرات پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ سزا و جزا کہاں اور کس طرح ہوتی ہے۔ تاہم چونکہ عام طور پر انسان اپنے مردوں کو قبر ہی میں دفن کرتے ہیں، اس لیے احادیث میں اسی کو قبر کے عذاب وثواب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآنی بیانات

ہر جان کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمہاری واپسی ہونی ہے۔ (الانبیا21:35)

''کہہ دو کہ تمہاری جان وہ فرشتہ ہی قبض کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' (السجدہ32:11)

''اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔''

(آل عمران3:145)

''روئے زمین پر جو بھی ہیں سب فانی ہیں اور تیرے رب کی عظمت وعزت والی ذات باقی رہنے والی ہے۔'' (الرحمٰن55:26-27)

''اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دو ان میں سے ہر ایک اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔'' (النساء4:78)

''جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے۔ وہ جواب دیں گے ہم تو اس ملک

میں بالکل بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کہ خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔'' (النساء4:97)

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے یا دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے۔'' (الانعام6:93)

''ان پر جن کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہوں گے تو اس وقت وہ سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کر رہے تھے۔ ہاں، بے شک اللہ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے رہے ہو۔'' (النحل16:28)

'' اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا۔ یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔''

(الانفال8:51-50)

''ان کو جن کو فرشتے پاکیزہ حالت میں وفات دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں آپ لوگوں پر سلامتی ہو۔ جنت میں جا براجیے اپنے اعمال کے صلہ میں۔'' (النحل16:32)

''وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا!......''

(یٰسین36:52)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (45)

شروع میں تو اس شخص کی اولاد اکٹھی رہتی ہو گی۔ بعد میں جب وسائل کی تنگی پیدا ہوتی ہو گی تو یہ لوگ مزید زمین کی تلاش میں بکھر جاتے ہوں گے۔ انسانوں کی موجودہ آبادی اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ یافث کی نسلوں یعنی یاجوج و ماجوج میں سب سے زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہ لوگ جلد سے جلد نئی زمینوں کی تلاش میں آرمینیا کے علاقوں سے نکل کر مشرق میں چین و ہندوستان، شمال میں روس اور مغرب میں یورپ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں روس اور الاسکا کے درمیان سمندر جما ہوا تھا چنانچہ یہ لوگ سمندر کے اوپر سفر کرتے ہوئے امریکہ جا پہنچے۔ جب یہ سمندر پگھل گیا تو ان کا رابطہ اپنے بھائیوں سے منقطع ہو گیا۔

اب عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ایک سروس اسٹیشن پر گاڑی روکی۔ یہاں کا پانی بہت سرد تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد باہر نکلا تو اسٹیشن کے ملازمین نے مجھے گھیر لیا اور تعارف کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ یہ جان کر وہ بہت خوش ہوئے کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ یہ لوگ کرد تھے۔ میں نے یونہی کہہ دیا کہ صلاح الدین ایوبی بھی تو کرد ہی تھے۔ یہ سن کر ان میں سے ایک صاحب پھڑک اٹھے اور اپنے ساتھیوں کو کہنے لگے: "تم کرد ہو، کیا تمہیں معلوم ہے کہ صلاح الدین ایوبی کرد تھے؟" انہوں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے: "دیکھو ہمارے پاکستانی بھائی کو یہ معلوم ہے۔ کچھ شرم کرو۔" ظاہر ہے وہ بے چارے تعلیم حاصل کیے بغیر کام کاج پر لگ گئے ہوں گے۔ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو گا کہ ان کے ایک بطل جلیل پر نہ صرف کرد قوم بلکہ پورا عالم اسلام فخر کرتا ہے۔

مغرب کے قریب جا کر کہیں ہم واپس ارض روم پہنچے۔ اتفاق سے ہم ایک بازار میں جا نکلے

جہاں پچھلی رات کی نسبت ایک بہتر ہوٹل میسر آ گیا۔ ہوٹل کی دیوار پر ترکی کا ایک نقشہ لگا ہوا تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے پوچھا کہ انقرہ جانے کے لئے کون سا راستہ بہتر ہے: بلیک سی کے ساتھ ساتھ براستہ ترابزن، سامسن اور سائنپ یا پھر اندرونی راستہ براستہ ارزنجان اور شیواس۔ کہنے لگے کہ اندر کا راستہ زیادہ بہتر ہے۔ اس سے بسیں 12 گھنٹے میں انقرہ پہنچتی ہیں۔ آپ اپنی کار پر ہیں، اس لئے جلدی پہنچ جائیں گے۔ ایک راستہ تو ہم آتے ہوئے دیکھ ہی چکے تھے، چنانچہ ہم نے اندرونی راستے سے واپسی کا ارادہ کیا۔

شیطانی انڈے

اگلی صبح ناشتہ کرنے کے لئے ہم ہوٹل کے ساتھ ہی واقع ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا جس میں فیملی ہال الگ تھا۔ یہاں ایک ترک انکل اور آنٹی بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً آج آنٹی کا ناشتہ بنانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں نے ویٹر سے آملیٹ کا پوچھا۔ جواب اثبات میں ملا۔ تھوڑی دیر بعد یہ صاحب تین تھالیاں اٹھا لائے جن میں ہاتھی کے کان سے بھی بڑے انڈے پڑے ہوئے تھے۔ چکھ کر دیکھا تو ذائقہ اپنے دیسی انڈوں جیسا محسوس ہوا۔ ماریہ روٹی کے بغیر انڈا کھایا کرتی تھی۔ اس نے اپنے انداز میں انڈا کھانا شروع کیا۔ ہم تینوں کھا کھا کر تھک گئے مگر انڈے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بمشکل ہم تینوں نے مل کر دو انڈے ختم کیے۔ تیسرے کو راستے کے لئے پیک کروا لیا۔

ہم سوچنے لگے کہ نجانے یہ انڈے کس بلا کے تھے جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ پہلے ہمارے ذہن میں شتر مرغ کا تصور آیا مگر اس کے انڈے اتنی آسانی سے دستیاب کہاں ہوتے ہیں۔ پھر ہم نے سوچا کہ شاید یہ بطخ کے انڈے ہوں اور آملیٹ دو انڈوں پر مشتمل ہو۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہاں سپر مارکیٹوں میں باقاعدہ ترکی کے انڈے ملتے ہیں۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا

نہ ہو جائے گا، یہ ترکی پرندے کے انڈے تھے، نہ کہ ترکی ملک کے۔ ان کا چھلکا چتکبرا ہوتا ہے۔

ارض روم کی قدیم مسجد اور مدرسہ

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ارض روم کی تاریخی عمارات دیکھنے کے بعد انقرہ کے لئے نکلا جائے۔ ہوٹل کی گلی سے نکل کر ہم مین روڈ بلکہ مین گلی میں آئے۔ میں نے گاڑی دائیں جانب موڑی کیونکہ رات ہم اسی طرف سے آئے تھے۔ اچانک سامنے سے آنے والی ہر گاڑی کے ڈرائیور نے چہرے پر سنگین تاثرات لا کر اشارے کرنا شروع کر دیے کہ ہم غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ چونکہ یہ اندرون شہر تھا، اس وجہ سے ٹریفک کا نظام ون وے تھا۔ تنگ ون وے گلی میں کسی نہ کسی طرح گاڑی موڑ کر ہم آگے بڑھے۔ تھوڑی دور جا کر ایک سیاہ رنگ کی مسجد نظر آئی۔

ایک جگہ بمشکل پارکنگ ملی۔ مسجد چھوٹی سی تھی۔ اس کے کتبے پر "قاسم پاشا جامع" لکھا ہوا تھا اور تاریخ 1657ء درج تھی۔ باہر سے تو مسجد کی حالت مخدوش نظر آ رہی تھی مگر اندرونی حصہ ترکی کی روایت کے مطابق خوب بھڑکیلے نقوش سے سجا ہوا تھا۔ مسجد میں کچھ بچے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر رہے تھے البتہ ان کے استاذ غائب تھے۔ میں یہاں کی تصاویر بنانے لگا۔ ایک بچے نے اپنی تصویر لینے کی فرمائش کر دی۔ مسجد کے قریب ہی موجود اسٹور سے ماریہ کے لئے آئس کریم خرید کر ہم اسی سڑک پر آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم ارض روم کے مشہور مدرسے تک پہنچ چکے تھے۔

مدرسے کی عمارت بہت شاندار تھی۔ مین گیٹ کے باہر وسیع دالان تھا جس میں پارک بنا ہوا تھا۔ مدرسے کا اندرونی حصہ U شکل میں بنا ہوا تھا۔ دونوں جانب کمرے تھے اور درمیان میں گھاس سے بھرا ہوا لان تھا۔ سامنے کی طرف مسجد تھی۔ مدرسے کے اوپر کی منزل بند تھی مگر نیچے

سے نظر آ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اناطولیہ کا سب سے بڑا مدرسہ تھا۔ مدرسے پر موجود کتبوں میں یہ درج تھا کہ اس کی درست تاریخ تعمیر کا علم نہیں ہے البتہ یہ طے تھا کہ یہ مدرسہ تیرہویں صدی کے نصف آخر میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ وہی دور تھا جب سلجوق سلطنت اپنے آخری سانس لے رہی تھی اور تاتاری ان کی سلطنت پر قابض ہو رہے تھے۔

مدرسے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سلجوق سلطان علاؤ الدین قیقباد کی بیٹی ہاندے خاتون نے تعمیر کروایا تھا۔ اس سے سلجوق بادشاہوں کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے آخری دور میں بھی انہوں نے تعلیم کے فروغ کی کوشش کی تھی۔ ان کی خواتین تک میں علم کو پھیلانے کا اتنا جذبہ تھا کہ اپنے زوال کے آخری دور میں بھی وہ مدرسے تعمیر کروا رہی تھیں۔ اسی دور کے مدارس ترکی کے دوسرے شہروں میں بھی موجود ہیں۔

مدارس کا نظام تعلیم

سلجوقوں کے دور میں تعلیم کو باقاعدہ اداروں کی شکل میں منظّم کیا گیا۔ یہ کارنامہ اس دور کے وزیر اعظم نظام الملک (م 485H / 1092CE) کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے ملک بھر میں بغداد سے لے کر نیشا پور تک مدارس کا جال بچھا دیا۔ مسلمانوں کے تاریخ کے کامیاب ترین ایڈمنسٹریٹرز کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے تو نظام الملک کا نام اس فہرست میں پہلے پانچ ناموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نصیحتوں پر مشتمل کتاب "سیاست نامہ" کے ترجمے آج بھی دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

غزل

کتنا سچّا ہے تو، کتنا پیارا ہے تو
سارے ٹوٹے دلوں کا سہارا ہے تو
اس جہاں میں اگر، غم کے مارے جئے
تو اسی آس پر کہ ہمارا ہے تو
مجھ کو طوفاں سے لڑنے کا یارا نہ تھا
ڈوبنے جب لگی تو کنارا ہے تو
جس نے ساحِل پہ کشتی کو پہنچا دیا
بہتی لہروں میں وہ تیز دھارا ہے تو
جب بھی مشکل سے تو نے نکالا مجھے
دل نے بے ساختہ یہ پکارا ہے تو
تو نے ظلمت سے بخشے اجالے مجھے
میری راتوں میں روشن ستارا ہے تو
تیری رحمت نے بڑھ بڑھ کے تھاما مجھے
باخدا، باخدا میرا یارا ہے تو
تو نے رنگِ حنا کو کیا معتبر
اس کا ہر ہر قدم پر سہارا ہے تو

خوشبوؤں کا حسیں، استعارا ہے تو
پھول، شبنم، کرن اور شرارا ہے تو
کون کہتا ہے یہ، تجھ کو دیکھا نہیں
اس زمیں تا فلک آشکارا ہے تو

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفر نامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

onthly
INZAAR

AUG 2017
Vol. 05, No. 08
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi